الگ کردیئے اور بقیہ اٹھارہ حصے مسلمانوں میں تقسیم کردیئے۔ (ایک حصہ کو سو حصوں میں تقسیم کرکے اٹھارہ سو حصے بنائے گئے۔)

ایک دوسری روایت میں ہے:

"قسم رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر نصفين نصفاً لنوائبه و حاجته ونصفاً بين المسلمين قسم بينهم".

(اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی جائداد کے آپؐ کے ہونے کا مطلب کیا ہے۔ (ابوداؤد مع معالم السنن ج ۴ ص ۲۳۸)۔)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا۔ نصف حصہ ہنگامی اور اپنی دوسری ضروریات کے لئے رکھا اور نصف مسلمانوں میں تقسیم فرمایا۔

خیبر کے بعد فدک اور وادیٔ القریٰ کی آراضی آپؐ کے قبضہ میں آئی۔ فدک کے بارے میں بھی یہ مشہور ہے کہ یہ جائداد آپؐ کی ذاتی ملکیت تھی مگر یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا چونکہ اس جائداد کے حاصل کرنے میں کوئی جنگ نہیں کرنی پڑی تھی، اس لئے آپؐ نے اس میں سے مخصوص مسلمانوں کو کوئی حصہ نہیں دیا، بلکہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے آپؐ نے اس کو اپنے قبضہ و نگرانی میں رکھا مگر اس کی ساری آمدنی مسافروں اور مہمانوں پر صرف فرماتے تھے۔ "وكان ما ياتيه منها الى ابناء السبيل".

بحوالہ: (فتوح البلدان ص ۳۶، ابوداؤد میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں:۔ "وكانت فدك لا بناء السبيل ، فدك" کی جائداد مسافروں کے لئے تھی۔)

جو کچھ اس سے آمدنی ہوتی تھی اس کو آپؐ مسافروں اور مہمانوں پر صرف فرماتے تھے۔ فدک و خیبر کے بعد مکہ فتح ہوا۔ (بعض لوگ کہتے ہیں کہ مکہ عنوۃً یعنی جنگ کے ذریعہ فتح نہیں ہوا اس لئے اس کی جائداد تقسیم نہیں ہوئی۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم نے بدلائل یہ بتایا ہے کہ یہ عنوۃً فتح ہوا اس کے باوجود آپؐ نے اس کو تقسیم نہیں کیا۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔)

مکہ کے بعد طائف اور حنین قبضہ میں آئے، مگر ان سب کے لئے مسلمانوں کو باقاعدہ جنگ کرنا پڑی، بلکہ حنین و طائف میں تو جان و مال کی بھاری قربانی بھی دینی پڑی۔ مگر ان تینوں جگہوں میں سے کسی جگہ کی زمین آپ نے فوجیوں میں تقسیم نہیں کی، مکہ میں صرف مہاجرین کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے ان مکانات پر قبضہ کرلیں، جو ہجرت کے وقت وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جن پر کفار نے قبضہ کرلیا تھا۔ طائف کے بعد کوئی ایسا مقام نہیں تھا جس کو آپؐ نے باقاعدہ فتح کرکے قبضہ فرمایا ہو۔

منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کی تقسیم کے بارے میں جو طرز عمل آپؐ نے غزوۂ بدر سے لے کر غزوۂ طائف تک اختیار فرمایا تھا، اس کا ایک مختصر خاکہ آپ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کو دیکھئے جو انہوں نے سوادِ عراق کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق میں بالکل وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخریق کے اثاث... بنو نضیر کی جائداد، خیبر کی نصف زمین اور فدک و وادی القریٰ کی آراضی اور مکہ و طائف کے مملوکات میں اختیار فرمایا تھا۔ آپؐ نے بنو قریظہ کی زمین و باغات کے علاوہ کسی غیر منقولہ جائداد کو بھی مکمل طور پر تقسیم نہیں فرمایا بلکہ بنو قریظہ کے بارے میں بھی بعض روایتوں میں

آتا ہے کہ اس کو صرف آپؐ نے مہاجرین ہی میں تقسیم کیا تھا، انصار میں صرف دو یا تین آدمیوں نے حصہ پایا تھا۔ غرض یہ کہ غیر منقولہ جائداد کی آپؐ نے جو بھی تقسیم فرمائی وہ اس بنا پر نہیں کہ وہ لازماً فوجیوں کا حق تھا بلکہ ضرورت و مصلحت کے تحت آپؐ نے ان کی تقسیم فرمائی۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق تمام تر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے ہے جو آپؐ نے فے و غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے غیر منقولہ جائدادوں میں مختلف طرزِ عمل کیوں اختیار فرمایا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے ایسا اپنے جی سے نہیں بلکہ قرآن کی ہدایت و اجازت سے کیا۔

فے و غنیمت کے سلسلہ میں قرآن نے ابتداء ہی سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی کہ یہ مال غنیمت محض تمہاری کوششوں سے نہیں ملا ہے بلکہ یہ خدا کا عطیہ و انعام ہے۔ چنانچہ پہلی بار غزوہ بدر میں غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں مسلمانوں نے آپؐ سے سوال کیا تو ان کو جواب دیا گیا کہ یہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے۔

"یسئلونک عن الانفال قل النفال للہ والرسول"۔ ترجمہ: تم سے یہ مالِ غنیمت"۔ (انفال) کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ یہ خدا اور اس کے رسول کا حق ہے۔

اس جواب کے بعد اس بارے میں ان کو کچھ اور تنبیہیں بھی کی گئیں، اس کے بعد کچھ اور احکام دیئے گئے۔ پھر اس کا مصرف بتایا گیا۔

"واعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ، وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل".

جان لو کہ جو مالِ غنیمت تم کو ملے اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور اس کے رسول اور ان کے قرابت داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے۔

اس آیت میں غنیمت کے کل حصہ کے ۱/۵ کا مصرف تو بتا دیا گیا مگر بقیہ ۴/۵ حصہ بہر صورت فوجیوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوتا تو اس کی تصریح قرآن ضرور کر دیتا۔ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوہ سے جو اس کی تبیین و تفسیر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منقولہ چیزیں اگر وہ جنگ سے حاصل ہوئی ہیں تو لازماً فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ اور اگر بغیر جنگ سے حاصل ہوئی ہیں تو لازماً فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں گی اور اگر بغیر جنگ کے کوئی منقولہ مال ملا ہے تو اس کو عامۃ المسلمین میں تقسیم کر دیا جائے گا، یا اس سے ان کے مفاد کا کوئی کام کیا جائے گا۔ غزوۂ بدر میں کوئی منقولہ جائداد مسلمانوں کو نہیں ملی تھی اور نہ ان کے سامنے اس کی تقسیم کا کوئی سوال پیدا ہوا تھا بلکہ صرف منقولہ چیزیں ملی تھیں اور اسی کو آپؐ نے ان کے درمیان تقسیم فرمایا تھا۔ (۱)

---

(۱) (مگر چونکہ یہاں لفظ عام واقع ہوا ہے: "انما غنمتم من شی"، جس سے منقولہ اور غیر منقولہ دونوں طرح کی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں اس لئے بعض آئمہ نے آپؐ کے اس طرزِ عمل پر جو آپؐ نے منقولہ اموال کے بارے میں اختیار فرمایا تھا غیر منقولہ چیزوں کو بھی قیاس کیا مگر یہ محض قیاس ہے کہ آگے قرآن کی صراحت آ رہی ہے۔)

غیر منقولہ جائداد کے بارے میں اصل ہم غزوۂ بدر کے دوسال بعد یعنی ۴ھ میں بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت نازل ہوا۔

"وما افاء الله على رسوله منهم فما اوجفتم عليه من خيل ولا ركاب ولكن الله يسلط رسله على من يشاء والله علىٰ كل شيىء قدير". (حشر)

ترجمہ:۔ جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوادیا ہے اس کے لئے تم نے نہ تو گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو جس پر چاہتا ہے غالب کرتا ہے اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ حکم خاص طور پر ان اموال کے بارے میں ہے جو بغیر جنگ کے اسلامی حکومت کے ہاتھ میں آئیں۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، اس کے بارے میں اس آیت میں یہ بات بتا کر غلبہ واقتدار خدا کا وہ خاص فضل ہے جو اس کے رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے، اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اس غلبہ کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کو کسی خاص فرد کی ملکیت میں نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کا اصل مالک تو خدا ہے اور خدا کی نیابت اس دنیا میں نبی کرتا ہے اس لئے اس کا مصرف اپنی صواب دید سے وہی مقرر کرے گا۔ (بالا آیت کی تفسیر کے لئے احکام القرآن جصاص اور احکام القرآن قاضی ابوبکر بن عربی مالکی اور زاد المعاد دیکھنی چاہیئے)۔

چنانچہ مذکورہ آیت کے بعد پھر متعدد آیتیں اس کی توضیح کے لئے نازل ہوئیں، جن میں واضح طور پر بتایا گیا کہ آئندہ جو بھی جائداد ہاتھ آئے گی وہ کسی مخصوص گروہ کا حصہ نہیں ہوگی، بلکہ اس میں موجودہ مسلمانوں کے ساتھ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کا حق بھی ہے، اور اس تقسیم کا حق چند قیود کے ساتھ صرف امام وقت یا حکومت راشدہ کو ہوگا۔ وہ آیتیں یہ ہیں:۔

"ما افاء الله على رسوله من اهل القرى فلله وللرسول ولذى القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل".

(یہاں تک تو ان ہی مصارف کا ذکر ہے جن کا ذکر سورۂ انفال میں خمس کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ مگر آگے اس کے مصارف کو والذین جاء وامن بعدھم کہہ کر بالکل عام کر دیا گیا ہے۔)

"كيلا يكون دولة بين الاغنياء منكم وما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا واتقوا الله ان الله شديد العقاب". (سورہ حشر)

(ان آیات کی جو تشریح امام ابوبکر جصاص نے کی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

سورۂ انفال کی آیت: "واعلموا انما غنمتم" کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فى الاموال سوى الارضين وفى الارضين اذا اختار الامام ذالك.

پھر سورۂ حشر کی ان آیات کے بارے میں فرماتے ہیں:

وما افاء الله على رسوله من الارضين فالله وللرسول ان اختار تركها علىٰ ملك اهلها ويكون ذكر الرسول هنا تفويض الامر عليه فى صرفه الى من راى".

یعنی سورۂ انفال کا تعلق منقولہ اموال سے ہے اور سورۂ حشر کا تعلق غیر منقولہ سے ہے۔

آیت کا ترجمہ:۔''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دوسری بستی والوں سے رسول کو دلوایا ہے اس میں خدا کا حق ہے اور رسول کا حق ہے قرابت داروں اور یتیموں کا حق ہے اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ تمہارے چند دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرنے لگے جو کچھ رسول تم کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے تم کو روک دیں رُک جاؤ اور اس بارے میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔

اس کے بعد پھر فقرائے مہاجرین کا تذکرہ کیا گیا ہے، پھر انصار کا، پھر اس کے بعد آنے والے مسلمانوں کے حق کے بارے میں وضاحت کی گئی۔

''والذین جاء و امن بعد هم''اور ان کے بعد جو مسلمان آئندہ آئیں گے ان کا حق بھی اس میں ہے۔(حشر، رکوع ۲)۔

ان آیات میں تین جملے خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ایک''کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم''اور دوسرا''ماآتاکم الرسول فخذوه وما نها کم عنه فانتهو ا اور تیسرا والذین جاء وامن من بعد هم''.

پہلے جملہ میں یہ تنبیہ کی گئی کہ ان اموال اور جائدادوں کی تقسیم اس طرح نہ کی جائے کہ یہ چند مخصوص آدمیوں کے ہاتھ میں چلی جائے، اور ان ہی میں گردش کرتی رہے، اور دوسرے لوگ اس سے بالکل محروم ہو جائیں۔

پھر دوسرے جملہ میں یہ بات بتائی گئی کہ اس کی تقسیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بھی کر دیں اس پر سب کو راضی ہو جانا چاہیئے کیونکہ اسلامی حکومت کے سربراہ اور بحیثیت نبی آپ کو یہ حق ہے کہ ضرورت و مصلحت کے تحت آپ جس طرح چاہیں اس کو تقسیم کریں۔

تیسرے جملہ میں پھر یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ صرف چند موجودہ مسلمانوں کا حق نہیں ہے، بلکہ قیامت تک اسلامی مملکت میں جو مسلمان پیدا ہوتے رہیں گے ان سب کا حق اس میں ہے۔

ان ہی آیات کی روشنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر منقولہ جائداد کے بارے میں وہ مختلف طرزِ عمل اختیار فرمایا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔اب قرآن کی ان تصریحات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر تنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نہیں بلکہ تمام قابلِ ذکر صحابہ کے فیصلہ پر ایک نظر ڈالیئے۔

عراق کا وہ ذرخیز علاقہ جو دجلہ و فرات کے درمیان واقع ہے، جس کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے اس کو عرب سواد کہا کرتے تھے۔ (جو چیز گہرے رنگ کی ہوتی ہے اس کو عرب عموماً سواد سیاہی مائل کہا کرتے ہیں۔)

وہ ۱۶ھ میں فتح ہوا۔ گو اس سے پہلے شام وغیرہ کے علاقے فتح ہو چکے تھے اور ان میں سے کسی علاقہ کو فوجیوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔

بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق کی فتح کے بعد امیرِ عراق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ان کے خط کے جواب میں یہ ہدایت بھیجی کہ:''امابعد ! فقد بلغنی کتابک تذکر فیه ان الناس سائلوک ان تقسم بینهم مغا نمهم وما افاء الله علیهم فاذا تاک کتابی هذا فانظر ما احبب الناس علیک به الی العسکر من کراع وما ل فاقسمه بین من

حضر من المسلمین واترک الارضین والانهار لعما لها لیکون ذالک فی اعطیات المسلمین فانک ان قسمتها بین من حضر کم لم یکن لمن بعد هم شی ء". (کتاب الخراج ص ۲۴)

ترجمہ:۔امابعد! تمہارا خط مجھے ملا۔جس میں ذکر ہے کہ لوگ غنیمت کے مال کو اور جو جائداد اللہ نے عنایت کی ہے، فوجیوں کے درمیان تقسیم کردینے کا سوال اٹھارہے ہیں۔تو جب میرا خط تمہیں پہنچے تو دیکھو کہ جو منقولہ مال وسامان اور جانور وغیرہ لوگوں نے دشمنوں سے حاصل کر کے تمہارے پاس جمع کردیا ہے اسے ان کے درمیان تقسیم کردو اور جتنی آراضی اور نہریں وغیرہ قبضہ میں آئی ہیں ان کے مالکوں کے ہاتھوں میں رہنے دو، تاکہ اس سے عام مسلمانوں کی مدد کی جاسکے اگر ان کو بھی تم نے تقسیم کردیا تو پھر بعد کے آنے والے مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں باقی رہے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے بعض صحابہ (جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ اور بلالؓ پیش پیش تھے) نے اس غلط فہمی کی بناء پر اختلاف کیا کہ سنتِ نبوی کے مطابق اسے فوجیوں کے درمیان تقسیم ہونا چاہیئے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تقسیم سے انکار کیا، لیکن جب ان حضرات کا اصرار بہت بڑھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عام صحابہ سے مشورہ کرلیا جائے۔ (تمام صحابہ کے ناموں کا ذکر نہیں ہے صرف بعض اجلہ صحابہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ وغیرہ کا ذکر ہے بعض روایتوں میں "فاستشار المهاجرین الاولین، سابقون الاولون مهاجرین" سے بھی مشورہ کیا، اور بعض روایتوں میں ہے کہ:۔" فارسل الیٰ عشرة من الانصار من کبرائهم واشرافهم انصار". میں سے جو دس ممتاز اور بڑے صحابہ تھے ان سب کو جمع کیا۔(کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۲۴)۔)

ان کی جیسی رائے ہوگی ویسے ہی عمل کیا جائے گا۔چنانچہ آپؐ نے سب کو جمع کر کے یہ تقریر کی۔حمد وثنا کے بعد فرمایا:"میں نے آپ لوگوں کو اس لئے جمع کیا ہے کہ میں نے آپ کے معاملات کی جو ذمہ داری اٹھائی ہے اس میں آپ میری مدد کریں، اس لئے کہ میں بھی آپ ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں۔آج آپ لوگوں کو ایک حق بات کا فیصلہ کرنا ہے۔اس میں آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس نے میری مخالفت کی ہے اور کس نے میری موافقت کی ہے۔میں نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش اور رائے کی پیروی کریں۔آپ کے ہاتھ میں کتاب اللہ موجود ہے جو خود حق بات کو واضح کردے گی۔میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصد اظہارِ حق ہوگا۔(اپنی رائے مسلط کرنا نہیں ہوگا)

"آپ لوگوں نے سنا ہوگا کہ جو لوگ سوادِ عراق کی تقسیم کے حامی ہیں ان کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق چھین کر ان کے اوپر ظلم کررہا ہوں، حالانکہ میں خدا سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں کسی کے اوپر کوئی ظلم کروں۔اگر میں کوئی ایسی چیز جو ان کی ملکیت میں ہوتی اسے چھین کر دوسروں کو دے دیتا تو یہ البتہ میری شقاوت اور میری بدبختی ہوتی۔مگر میرا خیال ہے کہ اگر میں نے کسریٰ (یہ علاقہ اس وقت ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور ان ہی سے مسلمانوں نے لیا تھا۔)

کی اس سرزمین کو تقسیم کردیا تو آئندہ کوئی حصہ فتح نہ کیا جاسکے گا۔(کیونکہ اس کے اخراجات کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔)(اور ممکن

ہے کہ زمین کے مالک یہ علاقہ چھوڑ دیں اور ساری زمین بیکار ہو جائے۔)

اس لئے میری رائے ہے کہ تمام اراضی کو ان کے مالکوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے اور ان کے اوپر جزیہ و اخراج عائد کر دیا جائے اور اس سے جو آمدنی ہو اس سے فوجیوں، معصوم بچوں اور آئندہ آنے والی نسل سب کو فائدہ پہنچایا جائے۔

کیا آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے کہ اسلامی مملکت کی سرحدوں کے لئے ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے جو وہاں ہر وقت پڑی رہے۔ کیا آپ لوگوں نے اس پہلو پر بھی سوچا ہے کہ اسلامی مملکت کے بڑے بڑے خطے اور شہر مثلاً جزیرہ، شام، کوفہ، بصرہ اور مصر کی حفاظت کے لئے بھی ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے اگر میں یہ سرزمین اس کے مالکوں سمیت فوجیوں میں تقسیم کر دوں تو اتنی بڑی فوج کا خرچ کہاں سے آئے گا.....

ان مصالح کا ذکر کرنے کے بعد پھر فرمایا کہ: ''میں نے جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ اپنے جی سے نہیں بلکہ کتاب اللہ کی روشنی میں ایسا کیا ہے..... پھر انہوں نے سورۂ حشر کی وہ آیات پڑھیں، جو اوپر درج کی جا چکی ہیں، پہلی آیت ''**وما افاء الله على رسوله منهم**'' کے بعد فرمایا کہ: ''بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور آگے والی آیت ہونے والی بستیوں کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد خدا نے مہاجرین کا ذکر کیا۔ پھر انہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انصار کا بھی ذکر کیا، پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ آخر میں کہا کہ:

''**والذين جاء وامن بعد هم**''. ''ان لوگوں کے بعد جو آئیں۔ (ان کا بھی حق ہے)''

ان آیات کی تلاوت و تفسیر کرنے کے بعد آخری ٹکڑے کے بارے میں فرمایا کہ:

''**فكانت هذه عامة من جاء من بعد هم فقد صار هذا الفئ من هولاء جميعا فكيف نقسم هولاء وندع من تخلف بعد هم بغير قسم**''. (**كتاب الخراج امام ابو يوسف .**)

ترجمہ:۔ تو یہ آیت عام جس سے ان تمام لوگوں کا حق ثابت ہوتا ہے جو موجود ہیں اور جو آئندہ آئیں گے تو جب اس میں حاضر و غائب سب کا حق تو پھر ہم اس کو صرف ان موجودہ فوجیوں میں کیسے تقسیم کر دیں اور جو ان کے بعد آنے والے ہیں ان کو کیسے محروم کر دیں۔

پھر **كيلا يكون دولة بين الاغنياء منكم** سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''**لو قسمتها بينهم فصارف دولة بين لاغنياء منكم**''. (**احكام القرآن جصاص تشريح سوره حشر**).

اگر میں ان کے درمیان اس کو تقسیم کر دوں تو یہ سرزمین چند دولت مندوں کی جاگیر ہو کر ان ہی میں گردش کرتی رہے گی۔ اس تقریر کے بعد پورے مجمع نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے خلاف کوئی فیصلہ کیا، یا کسی متفقہ اسلامی حکم کو پسِ پشت ڈال کر ایک نیا اجتہاد کیا۔ کیا اس تقریر کے ایک ایک حرف سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کتاب اللہ کی تصریحات سے مجبور ہو کر لیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جن اجتماعی مصالح کا ذکر کیا ہے وہ خواہ اپنی جگہ پر اتنے اہم تھے کہ اس کے

علاوہ کوئی فیصلہ کرنا اسلامی مملکت کو ختم کرنے اور جہاد کی روح کی بالیدگی کو روک دینے کے ہم معنی تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کا ذکر کیوں نہیں کیا جو آپؐ نے بنونضیر، خیبر، مکہ اور طائف وغیرہ میں اجتہاد فرمایا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جن اجتماعی مصالح کے پیش نظر منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں اور اموال میں مختلف طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا۔ ان کو نہ سمجھنے اور ان کے ہر پہلو پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے تو یہ اختلاف رونما ہوا تھا اس لئے اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ کتاب اللہ سے کوئی محکم دلیل پیش کردی جائے۔ تاکہ پھر کسی کو چوں وچرا گی کی گنجائش باقی نہ رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر منقولہ جائدادوں میں ہمیشہ افراد سے زیادہ اجتماعی مصالح کا لحاظ فرمایا۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل کتاب وسنت کے عین مطابق تھا۔

قطعِ ید کی منسوخی:

قرآن نے پہلی بار چوری کی سزا میں ایک ہاتھ کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، اگر وہ دوبارہ کرے تو دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائیگا۔

چنانچہ اس حکم کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ چوروں کو یہ سزا دی، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قحط کے زمانے میں اس سزا کو بند کردیا تھا۔

اگر حضرت عمرؓ نے قطع ید کی سزا کو مطلقاً بند کردیا ہوتا تو یقیناً یہ کہا جاسکتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کتاب وسنت کے ایک ثابت شدہ حکم میں اپنے اجتہاد سے تبدیلی کی، مگر اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سزا مطلقاً منسوخ نہیں کی بلکہ قحط کے زمانے میں اسے ملتوی کردیا تھا۔ اب یہ سوال یہاں ہوسکتا ہے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلقاً نہ سہی قحط کے زمانے میں اس سزا کو بند کردینے کا حق تھا، کیا کتاب وسنت میں اس کی کوئی دلیل ومثال موجود ہے؟ آئندہ سطروں میں ہمیں اسی سوال کا جواب دینا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس قحط میں چوروں کا ہاتھ کاٹنا بند کردیا تھا اس کی ہلاکت خیزی کا حال یہ تھا کہ پورے جزیرہ میں خاک اڑنے لگی تھی۔ سرسبزی اور شادابی کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔ فقر وفاقہ کی وجہ سے لوگ مردار اور چمڑے تک کھا جاتے تھے۔ اسی ہلاکت خیزی کی وجہ سے اس قحط کا نام عام الرمادہ پڑ گیا تھا، رماد خاک اور راکھ کو کہتے ہیں یعنی اس قحط میں ہر طرف خاک ہی خاک اڑتی نظر آرہی تھی اور لوگ فقر وفاقہ کی وجہ سے زمین سے لگ گئے تھے اور ان کے چہرے اور جسم کا رنگ تک سیاہ پڑ گیا تھا۔

یہ قحط ۱۸ھ میں پڑا تھا اور اس نے پورے جزیرۂ عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس کا سلسلہ تقریباً چھ سات ماہ تک رہا۔ اس میں عام باشندوں کا حال یہ تھا وہ گھاس پوس ہی نہیں بلکہ مردار، چمڑے اور ہڈی کا ستو کھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن قحط کے انتظام کے سلسلہ میں گشت لگا رہے تھے کہ مدینہ کے قریب کچھ خانہ بدوش لٹیرے یا دشمن قسم کے لوگ نظر آئے۔

(اوپر جولفظ محاربین استعمال ہوا ہے جس کے معنی دونوں ہو سکتے ہیں۔)

آپؓ نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ یہاں کیسے آئے؟ بولے کہ فقر وفاقہ کی شدت نے مدینہ کی طرف آنے پر مجبور کیا۔

(یا تو ان کا ارادہ لوٹ مار کا تھا، یا پھر مدینہ کے قریب اس غرض سے آئے ہونگے کہ شاید یہاں کفاف کا کوئی انتظام ہو سکے۔)

اس کے بعد ان لوگوں نے ایک مردار جانور کی بھنی ہوئی کھال نکالی اور اس کی ہڈیوں کو نکال کر اس کا ستو بنانے لگے تا کہ اس کو کھائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کیفیت دیکھی تو چادر بچھا کر وہیں بیٹھ گئے، خود اپنے اہتمام میں ان کے لئے کھانا پکوایا اور ان کو اپنے سامنے کھلایا۔ پھر اپنے خادم اسلم کو مدینہ بھیج کر چند اونٹ اور کچھ کپڑے منگوائے اور ان کو کپڑے پہنا کر اور اونٹوں پر سوار کر کے وہاں سے واپس کیا۔ (ازالۃ الخفاج ۲ ص ۱۵۴)

جب تک قحط کا سلسلہ رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ دن بھر روزے سے رہتے تھے، حکم تھا کہ ان کے سامنے گیہوں کی روٹی اور گھی نہ لایا جائے۔ صرف زیتون کا تیل اور جو کی روٹی لائی جائے۔ اسلم کا بیان ہے کہ ہم لوگ آپس میں کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے جلد قحط کی کیفیت دور نہ کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جائیں گے۔ **(سیرت عمر بن الخطاب ابن جوزی، ص ۶۹)**

اس قحط سالی کے رفع کرنے کے سلسلے میں جو تدبیریں اختیار کی گئیں تھیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی ساری مشینری اس میں لگا دی گئی تھی اور سارے ذرائع اس کے لئے وقف کر دیئے گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل تدبیریں کی گئیں:

۱۔ بیت المال میں جو کچھ تھا وہ سب غربا و مساکین میں تقسیم کر دیا گیا۔

۲۔ احتکار کرنے والوں کو سختی سے روکا گیا۔

۳۔ تمام ممالک محروسہ کے امراء کو مدینہ غلہ بھیجنے کا حکم دیا گیا تا کہ مستحقین میں تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق شام سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے غلہ سے لدے ہوئے چار ہزار اونٹ بھیجے۔ حضرت عمرو بن العاص نے مصر سے بحر قلزم کے راستہ سے ایک سو کشتی غلہ روانہ کیا۔

۴۔ اس پوری مدت میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ گوشت، گھی، گیہوں کھایا اور نہ دودھ کا ایک قطرہ چکھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑا ہوگا۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ روزانہ سینکڑوں اونٹ ذبح کئے جاتے تھے، اور ان کا گوشت پکا کر مستحقین کو کھلایا جاتا تھا۔ غلہ کی مفت تقسیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ **(سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی)**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام اعلان کرا دیا تھا کہ اگر خدا نے اس قحط سے جلد نجات نہ دی تو ہر کھاتے پیتے گھر میں چند غریبوں اور قحط زدوں کو بھیج دوں گا۔ تا کہ وہ اپنے کھانے میں ان کو شریک کر لیا کریں کیونکہ ایک آدمی کا کھانا آدمی کھا لیں گے تو دونوں ہلاکت سے بچ

جائیں گے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ابنِ جوزی)

یہ اس قحط کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قطعِ ید کی سزا کو منسوخ نہیں بلکہ ملتوی کر دیا تھا۔

سورۂ نجس العین ہے مگر قرآن نے ایک بھوکے مضطر کو سدرمق کے بقدر اس کا گوشت بھی کھالینے کی اجازت دی ہے۔ شراب، مردار وغیرہ کو قرآن نے قطعی حرام قرار دیا ہے مگر یہ چیزیں بھی ان لوگوں کے لئے بقدر سدرمق حلال ہیں جو فقر و فاقہ کی وجہ سے موت کے منہ میں جا پہنچے ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے جس قحط میں لوگوں کے اضطرار کی حالت یہ ہو کہ وہ گھاس پھوس نہیں بلکہ ہڈی اور مردار کھا کر پیٹ بھرنے پر مجبور ہوں اور بھوک و فاقہ کی وجہ سے زمین سے لگ گئے ہوں اور ہزاروں من غلہ اور گوشت مفت تقسیم کرنے کے بعد بھی لوگوں کے موت کے منہ سے بچنے کا کوئی صورت نہ ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو موت سے بچانے کے لئے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہوں کہ ایک ایک دو، دو فاقہ مستوں کو ہر کھاتے پیتے گھر میں بھیج دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ السارق والسارقت کے حکم کے تحت ان لوگوں کے ہاتھ کاٹتے جو اپنے کو موت سے بچانے کے لئے چوری پر مجبور ہو گئے تھے، یا وہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ والی آیت کے تحت ان کو مضطر قرار دے کر قطع ید کی سزا کو تھوڑے دن کے لئے ملتوی کر دیتے، اس موقع پر شریعت کے دو حکموں میں سے کسی حکم کو ترجیح دینا شرعی مصلحت کے مطابق تھا؟ کیا سزا کا موقوف کرنا منشائے قرآنی کے زیادہ مطابق تھا، یا اس کو نافذ کرنا؟

پھر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ قرآن نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کا جو حکم دیا ہے وہ بالکل مطلق ہے، تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر کوئی کسی کی ایک سوئی ایک ورق کاغذ، ایک بٹی صابن چُرا لے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے گا۔ قرآن کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی چیزوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔

مرواؔن کے زمانہ میں کسی غلام نے کسی کی تھوڑی سی کھجور چُرا لی کھجور والے نے مرواؔن کے پاس دعویٰ کیا۔ مرواؔن نے غلام کو قید کر دیا اور ارادہ کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔

اس غلام کا مالک ایک معروف صحابی رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور شرعی حکم دریافت کای۔ انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ، **لاقطع فی ثمر ولا ثمر** پھل اور کھجور کی چوری میں ہاتھ کاٹا نہیں جا سکتا۔ مالک حضرت رافع رضی اللہ عنہ کو لے کر مرواؔن کے یہاں پہنچا اور اس کو یہ حدیث نبوی سُنوائی۔ مرواؔن نے فوراً غلام کو آزاد کر دیا۔ (ابوداؤد مع معالم السنن)

اس حدیث کی روشنی میں آئمہ نے یہ اجتہاد کیا ہے کہ دودھ، پکے ہوئے کھانے، تازہ پھل اور گوشت وغیرہ کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ سے ایک بار درخت میں لگے ہوئے پھل کے بارے میں دریافت کای تو آپؐ نے فرمایا: ’’**مااصاب منہ من ذی حاجۃ غیر متخذ خبنۃً فلا شئی علیہ**‘‘۔

(یعنی مطلب یہ ہے کہ اگر وہ جمع کرنے کے لئے ایسا کرے گا تو پھر اس کو کچھ سزا بھی دی جائے گی اور اس سے تاوان بھی لیا جائے گا)۔

اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر کچھ پھل کھا پی لے تو اس پر کوئی سزا نہیں البتہ اس کو گٹھری باندھ کر گھر نہ لے جانا چاہیئے۔

یہ فرمانے کے بعد آپؐ نے ایک اصول مقرر فرمایا:۔

"ومن سرق شیئاً بعدان یوید الجرین فبلغ المحجن فعلیه القطع". (ابو داؤد).

غلہ اور پھل کے کھلیان یا گھر میں پہنچ جانے کے بعد جو شخص اس میں سے چوری کرے گا تو ایک ڈھال (اور ڈھال کی قیمت کے بارے میں ائمہ مختلف الرائے ہو گئے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے دس درہم سرقہ کا نصاب مقرر کیا ہے اور ائمہ ثلاثہ تین درہم میں قطع ید کا حکم دیتے ہیں، یہ اختلاف مجحن (ڈھال) ربع دینار کے اندازہ کی بنا پر ہے۔)

کی قیمت کے بقدر چوری کی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ پہلے جملہ میں تو آپؐ نے اہلِ ضرورت کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ بغیر اجازت کسی باغ سے پھل وغیرہ کھالیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ باندھ کر گھر لے جانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ دوسرے جملہ میں فرمایا کہ اگر کسی نے پھل یا غلہ کاٹ کر یا توڑ کر کھلیان یا گھر میں رکھ لیا ہے تو پھر اس کی چوری میں ہاتھ اس وقت کاٹا جائیگا جب وہ سو پچاس روپیہ کی قیمت کا ہو، دو چار روپے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بغیر ضرورت دو چار آنے کی چیز چرانے والے کو کوئی سزا نہ دی جائے گی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ تعزیر کی جائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کے عام حکم کے تحت ضرورت شدیدہ یا عام ابتلا کی وجہ سے اتنی تخصیص فرمائی ہے کہ اگر کوئی حاجت مند چھوٹی موٹی چیزیں بغیر اجازت استعمال کرے یا چُرا لے تو اس کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی تو جب عام الرمادہ میں لوگ اس سے زیادہ محتاج وضرورت مند تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قطع ید کی سزا ملتوی کر دی تو ان کا یہ فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف کیسے ٹھہر گیا۔ یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین وتخصیص کے عین مطابق تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کی وضاحت کے لئے ان کے ایک دوسرے فیصلہ پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے جو انہوں نے اہلِ اضطرار کے بارے میں فرمایا تھا۔

قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی ایک قیمتی اونٹنی حاطب ابن بلتعہ رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے چرائی مگر وہ پکڑے گئے۔ اونٹنی کا مالک ان کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے غلاموں نے چوری کا اقرار کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے مالکوں کو بلا کر واقعہ کی اطلاع دی اور کثیر بن الصلتؓ کو بلایا اور حکم دیا کہ ان کا ہاتھ کاٹ لو۔

یہ حکم دینے کے بعد ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا کہ غلاموں نے فقر وفاقہ سے مجبور ہو کر یہ غلط قدم اٹھایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غلاموں کے مالک کو بلایا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ تم ان سے کام لیتے ہو اور ان کو اتنا فاقہ مست رکھتے ہو کہ ان میں سے کوئی حرام چیز کھالے تو اس کے لئے حلال ہو جائے۔ تو میں ان کا ہاتھ ضرور کاٹ دیتا مگر اب ان کا ہاتھ کاٹنے کے

بجائے تم کو سزا دوں گا۔ چنانچہ مالک سے اونٹنی کی قیمت پوچھ کر ان سے اس کی قیمت دلوائی۔ ☆☆ (اعلام الموقعین، ج ۳ ص ۳۳)

آخر میں ہم حافظ ابن قیم کا وہ تبصرہ نقل کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ پر کیا ہے، لکھتے ہیں:

"فان السنة اذا كانت سنة مجاعة وشدة غلب على الناس الحاجة والضرورة فلا يكاد يسلم السارق من ضرورة قدعو ما يسد به رمقد".

قحط کے زمانے میں فقر و فاقہ کی شدت عام آدمیوں کو اتنا مجبور اور ضرورت مند بنا دیتی ہے کہ چور کے لئے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ سد رمق کے لئے چوری سے محفوظ رہ سکے۔

پھر ایک طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"له وما دون له في مقابلة صاحب المال علىٰ اخذا ماله لسدر مقه وعلم المجاعة يكثر فيه المحاويج والمضطرون ولا يتميز المستغني منهم والسارق بغير حاجة فاشتبه من يجب عليه الحدو بمن لايجب عليه فدرئ . نعم اذابان ان السادق لا حاجة به وهو مستغني عن السرقة قطع". (اعلام الموقعين ، ج ۳ ص ۳۳)

(اس عبارت میں اشارہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف جس میں فرمایا کہ شبہ کی حالت میں حد کے اجراء سے باز رہو، ادرءُ واالحدود بالشبہات موجودہ دور میں قانون فوجداری میں یہ فعہ بنیادی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ شبہ کا فائدہ مجرم کو دیا جائے۔)

چور کو یہ ڈھیل صرف ان دولت مندوں کے مقابلہ میں دی گئی ہے کہ ان کا مال وہ اس طرح لے کر اپنے جسم و جان کے رشتہ کو قائم رکھ سکیں (اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ) قحط کے زمانے میں ضرورت مندوں، بھوکوں اور اور مضطروں کی کثرت ہوتی ہے اور اس زمانہ میں یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہوتا ہے کہ کون مستغنی ہے اور ضرورت کے بغیر اس نے چوری کی ہے اس اشتباہ کی وجہ سے درگذر کیا گیا، البتہ جب یہ واضح ہو جائے کہ چوری کرنے والے کو واقعی اس غلط اقدام کی کوئی ضرورت نہیں تھی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جائے گا۔

ان تفصیلات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سزا کے التوا کا حکم اس لئے دیا کہ قحط کی حالت ایک اضطرار کی حالت ہوتی ہے، جس میں آدمی سد رمق کے لئے حرام کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے قرآن کی رخصت کے مطابق اہلِ اضطرار سے درگذر کرنا ضروری تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اس رخصت اور درگذر کے ساتھ اجرائے حد کا کوئی موقع نہیں رہ جاتا۔

(۲) سزا کے التواء کا عام حکم اس لئے دیا گیا کہ اس وبائے عام کے وقت اہلِ حاجت اور غیر اہلِ حاجت یا مضطر یا غیر مضطر میں فرق کرنے کا نہ تو موقع ہی تھا اور نہ ہی یہ ممکن تھا۔ اس لئے اس اشتباہ کی حالت میں ارشادِ نبوی ادرء واالحدود بالشبہات کے تحت عام درگذری سے کام لینا ضروری تھا۔

(۳) اگر کسی کے بارے میں متعین طور پر یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے بغیر کسی شدید ضرورت کے چوری کی ہے تو اس کا ہاتھ قطعی

کاٹ دیا جاتا۔

(۴) سزا کا التواء صرف زمانۂ قحط تک تھا۔ اس کے بعد پھر اسی طرح عمل درآمد کیا گیا جس طرح اس سے پہلے ہوتا تھا۔

کیا ان تفصیلات کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ کتاب وسنت کے خلاف تھا؟ یا انہوں نے اپنے اجتہاد سے کسی مخصوص حکم میں تبدیلی کی۔

حدِ خمر:

جن اولیاتِ عمر رضی اللہ عنہ کو تبدیلیٔ احکام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے ان میں ایک حدِ خمر (شراب کی سزا) بھی ہے، اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی میں شرابیوں کو محض چالیس کوڑے سزا دی جاتی تھی مگر حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے چالیس کے بجائے اسی کوڑے سزا مقرر کی، بادی النظر میں تبدیلیٔ احکام کی یہ دلیل واقعی بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے، مگر اس سلسلہ میں تمام تفصیلات جب سامنے آتی ہیں تو پھر اس دلیل میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

قرآن میں شراب کی حرمت کو حکم صراحۃً آیا ہے مگر اس کی سزا کے بارے میں صراحۃً کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شراب یا نشہ آور اشیاء کے پینے والوں کو ضرورت کے مطابق کم وبیش سزا تجویز فرمایا کرتے تھے کوئی متعین تعداد آپ نے مقرر نہیں فرمائی۔ چنانچہ کبھی کسی شرابی کو دس بیس کوڑے یا لات مکے مار کر چھوڑ دیا گیا اور کبھی تیس چالیس کوڑے اور کبھی اسی چھڑی یا کوڑے تک کی سزا دی گئی اور کبھی آپؐ نے حاضرین سے کہا، مارو جس کو جو کچھ ملا اس نے اس سے مارا، اس کا کوئی خاص شمار نہیں تھا کہ کتنی سزا دی گئی۔

عہدِ نبویؐ کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی بار جب کوئی شراب پئے تو اس کو کوڑے لگاؤ۔ دوبارہ پئے تو پھر سزا دو، تیسری بار بھی ایسا ہی کرو، اگر چوتھی بار پئے تو اس کو قتل کردو۔ (ابوداؤد) (بعض روایتوں میں پانچویں بار ہے۔)

اس روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کو کتنی سزا دینی چاہیئے مگر یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس گناہِ کبیرہ پر کوئی اصرار کرنے لگے تو چوتھی یا پانچویں بار قتل کردو۔ قتل کرنے کا حکم آپؐ نے دیا ہے وہ اگر محض تہدید اور اس کی اہمیت کے لئے ہے، واقعی قتل کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہ اسی طرح کا طرزِ بیان ہے جس طرح ہم بولتے ہیں کہ فلاں شخص تو قابلِ گردن زدنی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نہ تو خود آپؐ نے کسی عادی شرابی کو قتل کی سزا دی اور نہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے ایسا کیا، مگر اس سے شراب نوشی کے جرم کی اہمیت اور شدت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ عبدالرحمٰن بن ازہر روایت کرتے ہیں کہ گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شرابی لایا گیا۔ آپؐ نے حاضرین سے کہا کہ اس کو پیٹو۔ چنانچہ کسی نے ہاتھ سے، کسی نے جوتے سے، کسی نے ڈنڈے سے، کسی نے کھجور کی تازہ

ٹہنی سے مارا اور کسی نے اپنے کپڑے سے جھٹکا دیا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشتِ خاک اس پر پھینکی۔ (ابوداؤد اور بیہقی، ابوداؤد میں روایت مختصر اور بیہقی میں مفصل ہے۔)

اس روایت میں بھی سزا کی کوئی تعین نہیں ہے۔

۳۔ عقبہ میں حرث سے بھی بخاری میں اس طرح کی روایت ہے جس میں یہ ہے کہ نعیمان یا ابن نعیمان آپؐ کے سامنے لائے گئے، انہوں نے شراب پی تھی۔ آپؐ اس وقت گھر میں تشریف فرما تھے، جو لوگ وہاں بیٹھے تھے، ان سے آپؐ نے فرمایا کہ ان کو مارو، چنانچہ لوگوں کو جو چیز ملی اس سے مارا۔

۴۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شرابی کو آپؐ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے حاضرین سے فرمایا کہ اس کو مارو۔ چنانچہ کسی نے مکے سے، کسی نے کپڑے سے کسی نے جوتے سے مارا۔ (اتنے الفاظ بخاری اور ابوداؤد دونوں میں ہیں۔ بقیہ الفاظ صرف ابوداؤد کے ہیں)۔

پھر آپؐ نے فرمایا کہ بکتوہ یعنی اس کو زبانی زجر و توبیخ بھی کرو، چنانچہ کسی نے کہا کہ:

"ما اتقيت الله ما خشيت الله وما استحييت من رسول الله صلى الله عليه وسلم".

ترجمہ:۔ تو اللہ کی نافرمانی سے بھی نہیں بچا۔ تجھ کو خدا کا خوف بھی نہیں آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نہیں شرمایا۔

کسی نے کہا کہ خدا تجھ کو رسوا کرے۔ تو آپؐ نے اس سے منع فرمایا کہ اس سے شیطان کو مدد ہوتی ہے کیونکہ وہ تو چاہتا ہی ہے کہ خدا کے کسی بندہ کی رسوائی ہو۔

سائب بن یزید سے مروی ہے:

"كنا نوتى بالشارب على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وامرة ابى بكر وصدر امن خلافة عمر فنقوم اليه بايدينا ونعالنا وارديتنا". (بخاری)

عہد نبوی، عہدِ صدیقی، عہدِ فاروقی کے ابتدائی زمانہ تک جب ہمارے سامنے کوئی شرابی لایا جاتا تو ہم لوگ اس کو اپنے ہاتھوں جوتوں اور چادروں سے مارتے تھے۔

غرض یہ کہ اس سلسلہ میں جتنی قولی روائتیں مروی ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ آپؐ نے کتنی سزا دی، بلکہ آپؐ نے ہمیشہ حاضرین سے سزا دینے کے لئے کہا اور ان کو جو کچھ مل سکا اس سے شرابی کو زدوکوب کیا گیا۔ اسی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی کی کوئی متعین سزا مقرر نہیں کی۔ ابن عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں:

"آپؐ نے شراب نوشی کو کوئی سزا مقرر نہیں کی"۔

اور حضرت علیؓ کے الفاظ بخاری وغیرہ میں یہ آئے ہیں:

"لم یُسنه" آپ کا کوئی متعین طرزِ عمل اس بارے میں نہیں ہے۔

(بخاری ومسلم) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے بارے میں صحابہ سے جو روایتیں مروی ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے:

(۱) حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شرابی لایا گیا تو آپؐ نے اس کو کھجور کی چھال یا ریشے کی بنی ہوئی دو چھڑیوں یا کوڑوں سے تقریباً چالیس ضرب ماری (نحوار بعین) یہی طرزِ عمل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اختیار کیا، مگر حضرت عمرؓ نے ۸۰/ اسی کر دیا۔ (مسلم)

اسی روایت کے اوپر ان لوگوں کے استدلال کی بنیاد ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ۸۰/ اسی کوڑے کی سزا حضرت عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے مقرر کی۔

(۲) عہدِ نبویؐ اور عہدِ صدیقیؓ کے اس طرزِ عمل کے بارے میں حضرت انسؓ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک شرابی پر شراب نوشی کا جرم ثابت ہو گیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ اس کو سزا دیں۔ انہوں نے حضرت حسنؓ سے کہا۔ انہوں نے بھی گریز کیا۔ پھر ابن جعفرؓ سے کہا۔ ابن جعفرؓ نے سزا دینی شروع کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ گنتے جا رہے تھے۔ جب وہ چالیس کوڑے لگا چکے تو حضرت علیؓ نے کہا، رک جاؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے سزا دی اور حضرت عمرؓ نے ۸۰/ اسی، یہ دونوں طرزِ عمل یعنی چالیس/۴۰ اور چالیس /۸۰ قابلِ عمل ہیں لیکن مجھے یہی چالیس ہی کی سزا پسند ہے۔ (مسلم)

چونکہ ان ہی دونوں روایتوں پر سارے استدلال کی بنیاد ہے اس لئے ان پر قدرے تفصیل سے نظر ڈال لینی چاہیئے۔

پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو لیجئے۔ ان کی مذکورہ بالا روایت کے الفاظ مسلم میں ہیں، اور یہی روایت دوسرے واسطہ سے مسلم میں اور بخاری میں مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضرب فی الخمر بالجر ید والنعال وجلد ابوبکر اربعین".

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی سزا کھجور کے کوڑے اور جوتے سے دی اور حضرت ابوبکرؓ نے چالیس کوڑے کی سزا دی۔

یہی روایت ایک اور واسطہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں وجلد ابوبکر کے بجائے ثم جلد ابوبکر اربعین ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ مجلد عمر ثمانین۔ پھر یہی روایت ایک واسطہ سے مسلم میں ہے جس میں ہے کہ:

"ان البنی صلی اللہ علیہ وسلم کان یضرب فی الخمر بالجرید و النعال اربعین".

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات شراب کی سزا چالیس جوتے اور کوڑے دیا کرتے تھے۔

ان تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو ان سے حسب ذیل باتیں نکلتی ہیں:

(۱) آپؐ نے مدد کی تعیین کے بغیر جوتے اور کوڑے یا چھڑی سے سزا دی اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس

کوڑے سزادی، اوران کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی/۸۰ کوڑے سزامقرر کی۔

(۲) آپؐ نے دو چھڑیوں یا دو کوڑوں سے بیک وقت چالیس کے قریب سزادی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی/۸۰ کوڑے سزادی۔

(۳) آپؐ نے جوتے اور چھڑی دونوں سے چالیس ضرب لگائی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کیا۔ اگر ان تمام روایات اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کو اختلاف مواقع پر محمول کیا جائے تو پھر اس پر کوئی خاص اعتراض پیدا نہیں ہوتا کیونکہ قرآن جس بارے میں کوئی صریح حکم نہیں دیتا تھا، یا مطلق حکم دیتا تھا، آپؐ اس میں انتظامی ضرورت اور مصلحت کے پیشِ نظر مختلف طرزِ عمل اختیار فرمایا کرتے تھے۔ لیکن اگر ان تمام روایات کو ایک ہی واقعہ یا حکم کی مختلف تعبیر سمجھا جائے تو پھر اس میں توافق پیدا کرنا سخت مشکل ہے۔ خاص طور پر ان کی پہلی روایت کا، جس میں دو چھڑیوں سے بیک وقت مارنے کا ذکر ہے، دوسری اور تیسری روایت کے ساتھ کوئی توافق نظر ہی نہیں آتا۔

پہلی روایت میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں:

ایک یہ کہ اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اربعین (چالیس) نہیں بلکہ نحو اربعین قریب چالیس کہا ہے، ایسا کیوں ہے۔

دوسرے اس میں دو چھڑیوں سے بیک وقت مارنے کا ذکر ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

پہلی بات کا جواب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی متعین سزا نہیں دی، اس لئے جس صحابی کو جو علم ہوا یا انہوں نے جو اندازہ کیا اس کے مطابق بیان کیا اور چونکہ آپؐ نے مختلف مواقع پر جرم کی کمی یا زیادتی کے پیشِ نظر مختلف سزائیں دی، اس لئے اس اختلافِ احوال کا بیان حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

دوسری بات یعنی دو چھڑیوں سے مارنے کا مطلب بعض آئمہ حدیث نے یہ بیان کیا ہے کہ دونوں چھڑیوں یا دونوں کوڑوں سے الگ الگ چالیس ضربیں لگائیں یعنی ایک سے بیس، پھر دوسری سے بیس، یا کم وبیش۔ مگر اس روایت کا یہ مطلب مراد لینے میں تکلف محسوس ہوتا ہے اور یہ استدلال کی بنیاد بھی نہیں بن سکتی کیونکہ اس میں چالیس ضرب کا ذکر نہیں ہے بلکہ قریب چالیس کا ذکر ہے، تو پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ چالیس ضرب سنتِ نبوی ہے، بلکہ ان کی ایک روایت جو بخاری و مسلم دونوں میں ہے:

''اُتی برجل قد شرب فجلد مجریمتین نحوا ربعین''.

بظاہر اس کے دو مطلب سمجھ میں آتے ہیں، ایک یہ کہ آپؐ نے خود سزا نہیں دی، بلکہ جیسا کہ آپؐ کا دستور تھا، حاضرین سے سزا دینے کے لئے فرماتے تھے، اس لئے ممکن ہے کہ اس وقت دو آدمی موجود رہے ہوں اور آپؐ نے ان سے فرمایا ہو، اور دونوں آدمیوں نے دو چھڑیوں سے مارا ہو۔ اور اسی سزا دینے والوں کو حضرت انسؓ نے اس طرح بیان کیا ہو کہ آپ نے دو چھڑی سے سزادی۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے خود یا جن صاحب کو حکم دیا ہو انہوں نے دو چھڑیوں یا دو کوڑوں کو ملا کر سزادی ہو تا کہ ضرب